کے بال منڈے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی گٹھڑی کے سوا اس کے پاس اور کوئی اثاثہ بھی نہ تھا۔

رما کو اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ ''آپ ہاوڑہ ہی اتریں گے یا کہیں اور جائیں گے؟''

رما نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''بابا! میں اگلے سٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ روپے کا کوئی انتظام کر کے پھر آؤں گا۔''

بوڑھا: ''تمہیں کتنے روپے چاہئیں، مجھ سے لے لو۔ میں بھی تو وہیں چل رہا ہوں۔ جب چاہے دے دینا۔ کیا میرے دس پانچ روپے لے کر بھاگ جاؤ گے۔ گھر کہاں ہے؟''

رما: ''میں الہ آباد میں رہتا ہوں۔''

بوڑھے نے عقیدت کے جوش سے کہا۔ ''پراگ راج کی کیا بات ہے۔ میں بھی تربینی کا اشنان کر کے آ رہا ہوں۔ سچ سچ دیوتاؤں کی پور ہے، تو کتنے روپے نکالوں؟''

رما نے شرماتے ہوئے کہا:

''میں چلتے ہی چلتے روپے نہ دے سکوں گا۔ یہ سمجھ لو۔''

بوڑھا مسکرا کر بولا:

''بھیا میرے دس پانچ روپے لے کر تم بھاگ تھوڑے جاؤ گے؟ میں نے تو دیکھا پراگ کے پنڈے جاتریوں کو بنا لکھا پڑھی روپے دے دیتے ہیں۔ دس روپے میں تمہارا کام چل جائے گا؟''

رما نے سر جھکا کر کہا ''ہاں اتنے کافی ہیں۔''

ٹکٹ چیکر کو کرایہ دے کر رما سوچنے لگا۔ یہ بوڑھا کتنا صاف دل، کتنا بے لوث، کتنا نیک نیت واقع ہوا ہے۔ جو لوگ مہذب کہلاتے ہیں، ان میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے، جو اتنی فراخدلی سے کسی مسافر کی مدد کر سکیں۔

دوران گفتگو رما کو معلوم ہوا کہ بوڑھا ذات کا کھٹک ہے۔ کلکتہ میں اس کی سبزی کی دکان ہے۔ اس کا وطن تو بہار ہے، مگر چالیس سال سے کلکتے ہی میں دکان کر رہا ہے۔ دیبی دین نام ہے۔ اس وقت بدری ناتھ کی یاترا کر کے لوٹا جا رہا ہے۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم بدری ناتھ کی یاترا کر آئے۔ وہاں تو پہاڑوں کی بڑی چڑھائیاں ہیں؟''

دیبی: ''بھگوان کی مرضی ہوتی ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے بابو جی۔ ان کی نگاہ چاہیے۔''

رما: ''تمہارے بال بچے تو کلکتہ ہی میں ہوں گے؟''

دیبی دین نے دردناک تبسم سے کہا۔ ''بال بچے تو سب بھگوان کے گھر چل دیئے۔ چار بیٹے تھے، دو لڑکوں کا تو بیاہ ہو چکا تھا۔ سب چل دیئے۔ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اپنے بوئے ہوئے بیج کو کسان ہی تو کاٹتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور بولا:

''بڑھیا ابھی جیتی ہے۔ دیکھیں ہم دنوں میں پہلے کون چلتا ہے۔ وہ کہتی ہے پہلے میں جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھیں دونوں میں کس کی

ٹیک رہتی ہے۔تم کبھی آنا تو دکھاؤں گا۔اب بھی اسے گہنوں کا شوق ہے۔سونے کی بالیاں اور سونے کی ہنسلی پہنے دکان پر بیٹھی رہتی ہے۔جب کہا تیرتھ کرآویں تو بولی۔تمہارے تیرتھ کے لیے کیا اپنی دکان مٹی میں ملا دوں۔آدمی کی ہوس ایسی ہوتی ہے،آج مرے کل دوسرا دن۔مگر دکان نہ چھوڑے گی،نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔نہ کوئی رونے والا،نہ کوئی ہنسنے والا،مگر ہوس نہیں جاتی۔اب بھی کوئی نہ کوئی گہنا بنواتی رہتی ہے۔نہ جانے کب اس کا پیٹ بھرے گا۔گھر گھر یہی حال ہے۔جہاں دیکھو ہائے گہنے! ہائے گہنے! گہنے کے پیچھے جان دے دیں۔گھر کے آدمیوں کو بھوکا ماریں۔گھر کی چیزوں کو کوڑا کر دیں اور کہاں تک کہوں۔اپنی آبرو تک بیچ دیں۔چھوٹے بڑے امیر غریب سبھی کو یہی روگ لگا ہوا ہے۔کلکتہ میں کہاں کام کرتے ہو بھیا؟''

رما:''ابھی تو جا رہا ہوں قسمت آزمانے۔دیکھوں کوئی نوکری چاکری ملتی ہے یا نہیں؟''

دیبی:''تو پھر میرے یہاں ٹھہرنا۔نیچے دو کوٹھڑیاں ہیں اور ایک دالان۔اوپر ایک کوٹھڑی اور چھت ہے۔آج بیچ دوں تو دس ہزار ملیں۔اوپر والی کوٹھڑی تمہیں دے دوں گا۔جب کہیں کام مل جائے،اپنا گھر لے لینا۔پچاس سال ہوئے گھر سے بھاگ کر ہوڑ سے گیا تھا۔دانے دانے کو محتاج تھا۔تب سے سکھ بھی دیکھے اور دکھ بھی دیکھے۔اب تو یہی کہتا ہوں بھگوان لے چلو۔ہاں بڑھاپا جیتی رہے۔نہیں تو اس کی دکان کون لے گا۔گھر کون لے گا اور گہنے کون لے گا؟''

یہ کہہ کر دیبی دین پھر ہنسا۔وہ اتنا زندہ دل،اتنا خوش مزاج تھا کہ رما تعجب کر

رہا تھا۔ بے بات کی بات پر ہنستا تھا۔ جس بات پر اور لوگ روتے ہیں، اس پر اسے ہنسی آتی تھی۔ اتنی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ کتنے ہی لطیفے یاد تھے۔ بات بات پر لطیفہ کہتا تھا۔ گویا رما سے برسوں کی ملاقات ہے۔ رما کو بھی اپنے متعلق ایک فرضی قصہ کہنا پڑا۔

دیبی دین: ''تو یہ کہو تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔ سمجھ گیا۔ گھر میں جھگڑا ہوا ہوگا؟ بہو کہتی ہوگی۔ میرے پاس گہنے نہیں۔ میرے نصیب جل گئے۔ ساس بہو میں ٹھنی رہتی ہوگی۔ تم نہ ادھر سے بول سکتے ہو، نہ ادھر سے۔ جب نہ برداشت ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔''

رما: ''ہاں بابا! بالکل یہی کیفیت ہے مگر تم نے کیسے تاڑا؟''

دیبی دین ہنس کر بولا: ''یہ بھی ایک علم ہے بھائی۔ بڑی محنت سے آتا ہے۔ ابھی لڑکے بالے تو نہ ہوں گے؟''

رما: ''نہیں، ابھی تو نہیں ہیں۔''

دیبی: ''چھوٹے بھائی ہوں گے؟''

رما حیرت میں آ کر بولا۔ ''ہاں دادا ٹھیک کہتے ہو تم نے کیسے جانا؟''

دیبی دین پھر قہقہہ مار کر بولا۔ ''یہ سب منتروں کا کھیل ہے۔ سر مالدار ہے، کیوں؟''

رما: ''ہاں ہے تو۔''

دیبی: ''مگر ہمت نہ ہوگی؟''

رما: ''بہت ٹھیک کہتے ہو دادا، جب سے شادی ہوئی، اپنی لڑکی تک کو تو بلایا

نہیں۔''

دیبی: ''سمجھ گیا بھیا! یہی دنیا کا دستور ہے۔ بیٹے کے لیے کہو چوری کریں، بھیک مانگیں۔ بیٹی کے نام گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔''

تین دن سے رما کو نیند نہیں آئی تھی۔ دن بھر روپوؤں کی فکر میں مارا مارا پھرتا۔ رات بھر تارے گنا کرتا۔ اس وقت سنتے سنتے اسے نیند آ گئی۔ جھپکی لینے لگا۔ دیبی دین نے فوراً اپنی بقچی کھولی۔ اس میں سے ایک دری نکالی اور تختہ پر بچھا کر بولا:

''اس پر لیٹ رہو بھیا! میں تمہاری جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔''

رما لیٹ رہا۔ دیبی دین بار بار محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا، گویا اس کا اپنا لڑکا کہیں پردیس سے لوٹا ہو۔

(22)

جب رما نا تھ اوپر سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس وقت جالپا کو اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس نے وہ رقعہ پڑھ لیا تھا۔ اسے ایسا اشتعال ہو رہا تھا کہ جا کر رما کو خوب کھری کھری سنائے، مجھ سے یہ دغا، مگر ایک ہی لمحہ میں اس کا غصہ فرو ہو گیا۔ خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں ہوا ہے کہ سرکاری روپے خرچ کر ڈالے ہوں۔ ضرور یہی بات ہے۔ رتن کے روپے صراف کو دے دیئے ہوں گے۔ اس دن رتن کو دکھلانے کے لیے شاید وہ سرکاری روپے اٹھا لائے تھے۔ اسی کو پورا کرنے کے لیے روپوؤں کی ضرورت ہوگی۔ یہ سوچ کر اسے رما پر غصہ آیا۔ یہ مجھ سے کیوں اتنا پردہ کرتے ہیں۔ کیوں مجھ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ دنیا میں امیر و غریب دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کیا سبھی

عورتیں زیوروں سے لدی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب اور ضروری کاموں سے روپے بچتے تب زیور بھی بن جاتے ہیں۔ پیٹ اور تن کاٹ کر چوری یا بے ایمانی کر کے تو زیور نہیں بنواء جاتے۔ کیا انہوں نے مجھے اتنا خودغرض سمجھ لیا ہے۔

اس نے سوچا رما اپنے کمرے میں ہوں گے۔ چل کر پوچھوں کون کون سے زیور چاہتے ہیں۔ صورت حال اتنی خطرناک ہے۔ اس کا خیال کر کے اس کے دل پر غصے کے بجائے خوف طاری ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے اتری۔ اسے یقین تھا کہ رما نیچے بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے، مگر مرے میں آئی تو ان کا پتہ نہ تھا۔ سائیکل رکھی ہوئی تھی۔ فوراً دروازے سے جھانکا۔ سڑک پر بھی نہیں۔ کہاں چلے گئے۔ دونوں لڑکے اسکول گئے تھے۔ کس کو بھیجے کہ جا کر انہیں بلا لاوے۔ اس کے دل پر موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ فوراً اوپر گئی۔ گلے کا ہار اور ہاتھ کے کنگن رومال میں باندھے۔ پھر نیچے اتری۔ سڑک پر آ کر ایک تانگہ لیا اور کوچوان سے بولی:

''چنگی کچہری چلو۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی پس و پیش میں کیوں پڑی رہی؟ کیوں نہ فوراً زیور اتار کر انہیں دے دیئے۔''

راستہ میں وہ دونوں طرف غور سے دیکھتی جاتی تھی۔ کیا اتنی جلدی دور نکل آئے۔ شاید دیر ہو جانے کے باعث وہ بھی آج تانگے پر ہی گئے ہوں۔ نہیں تو اب تک ضرور مل گئے ہوتے۔ تانگے والے سے بولی:

''کیوں جی تم نے ابھی کسی بابو جی کو تانگے پر جاتے دیکھا ہے؟''

تانگے والے نے کہا:

''ہاں بہو جی، ابھی ادھر سے تو گئے ہیں۔''

جالپا کو کچھ تسکین ہوئی۔ رما کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی پہنچ جائے گی۔

کوچوان سے بار بار گھوڑا بڑھانے کو کہتی تھی۔ جب وہ دفتر پہنچی تو گیارہ بج گئے تھے۔ سینکڑوں آدمی ادھر ادھر دوڑے نظر آتے تھے۔ کس سے پوچھے؟ کس کے پاس جائے۔ وہ نہ جانے کہاں بیٹھتے ہیں؟

دفتر کا چپڑاسی دکھائی دیا۔ جالپا نے اسے بلا کر کہا:

''سنو جی! ذرا بابو رمانا تھ کو تو بلاؤ؟''

چپڑاسی بولا: ''انہی کو تو بلانے جا رہا ہوں۔ بڑے بابو نے بھیجا ہے۔ آپ کیا ان کے گھر سے ہی آ رہی ہیں؟''

جالپا: ''ہاں میں تو گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ ابھی دس منٹ ہوئے، وہ گھر سے چلے گئے ہیں۔''

چپڑاسی: ''یہاں تو نہیں آئے۔''

جالپا کو بڑی تشویش ہوئی۔ ''وہ یہاں بھی نہیں آئے۔ راستے میں بھی نہیں ملے۔ تو پھر گئے کہاں۔''

کسی سانحہ کے خیال سے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہاں بڑے بابو کے سوا اور کسی کو نہ جانتی تھی۔ ان سے ہم کلام ہونے کا اسے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا، مگر اس وقت اس کا حجاب رخصت ہو گیا۔ خوف دل کے سارے جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

چپڑاسی سے بولی: ''ذرا بڑے بابو سے کہہ دو۔ نہیں چلو میں ہی چلتی ہوں۔''

جالپا کی وضع قطع دیکھ کر چپڑاسی رعب میں آ گیا۔ الٹے پاؤں بڑے بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ جالپا اس کے پیچھے ہو لی۔ بڑے بابو خبر پاتے ہی باہر نکل آئے۔

جالپا نے بڑے بابو کو سلام کر کے کہا:

''معاف کیجیے گا بابو جی۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔ انہیں گھر سے چلے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے مگر ابھی یہاں تک نہیں پہنچے۔ آپ سے کچھ کہا تو نہیں؟''

رمیش: ''آپ مسز رمانا تھ ہیں؟ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں۔ تعجب ہے، کہاں رہ گئے؟''

جالپا نے چپڑاسی کی طرف تاکتے ہوئے کہا:

''میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

رمیش: ''ہاں ہاں! میرے کمرے میں آ جاؤ۔ کہیں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہوں گے۔''

جالپا: ''نہیں بابو جی! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں اور نہ چلے گئے ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے میرے نام ایک پرزہ لکھا تھا (جیب سے پرزہ نکال کر) دیکھئے۔ وہ پرزہ موجود ہے۔ آپ ان پر شفقت کی نگاہ رکھتے ہیں، آپ سے کیا پردہ۔ ان کے ذمے کوئی سرکاری رقم تو نہیں آتی؟''

رمیش نے متعجب ہو کر کہا: ''کیوں، انہوں نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا؟''

جالپا: ''بالکل نہیں۔''

رمیش: ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج انہیں تین سو روپے جمع کرنے ہیں۔

پرسوں کی آمدنی انہوں نے جمع نہیں کی تھی۔ روپے تھیلی میں رکھے اور نوٹ جیب میں رکھ کر گھر چلے گئے۔ بازار میں کسی نے جیب سے نوٹ نکال لیے (مسکرا کر) چال چلن کے بارے میں تو مجھے کبھی شک کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر جوانی کے جنون میں اگر طبیعت بہک گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔''

جالپا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی ''آپ بزرگ ہیں۔ آپ سے کیا عرض کروں مگر جیب سے نوٹوں کا نکل جانا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسے واقعے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کسی نے نکال لیے ہوں گے۔ مارے شرم کے انہوں نے مجھ سے کہا نہ ہوگا۔ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو فوراً روپے نکال کر دے دیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔''

رمیش: ''کیا گھر میں روپے ہیں؟''

جالپا نے بے باکانہ انداز سے کہا: ''تین سو چاہئیں نا؟ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''

رمیش: ''اگر وہ آ گئے ہوں تو بھیج دینا۔''

جالپا آ کر تانگے پر بیٹھی اور کوچوان سے چوک چلنے کو کہا۔ اس نے اپنا بار بیچ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں اس کی کئی سہیلیاں تھیں، جن سے اس کو روپے مل سکتے تھے۔ عورتوں میں باہم بڑا خلوص ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح ان کی دوستی محض پان پتوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتی، مگر اس کا موقع نہ تھا۔ صرافہ میں پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔ کس دکان پر جاؤں۔ خوف ہو رہا تھا۔ ٹھگی نہ جاؤں۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگا آئی۔ کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر وقت بھی

گزرا جاتا تھا۔ آخر ایک دکان پر ایک بوڑھے صراف کو دیکھ کر اس کا حجاب کچھ کم ہوا۔ صراف بڑا گھاگ تھا۔ جالپا کو جھجکتے اور ہچکتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اچھا شکار پھنسا۔

جالپا نے ہار دکھا کر کہا۔ ''میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔''

صراف نے ہار کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ ''مال تو چوکھا نہیں ہے، آپ نے کہاں سے بنوایا تھا؟''

جالپا: ''اس سے تمہیں کیا مطلب؟ تمہیں پسند ہے یا لینا ہے تو بتلاؤ کیا دو گے؟''

صراف نے ساڑھے تین سو دام لگائے اور بڑھتے بڑھتے چار سو تک پہنچا۔

چھ سو کی چیز چار سو میں دیتے ہوئے قلق ہو رہا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ مارے اا لچ کے ہار کو بڑی احتیاط سے پہنا تھا۔ مفت میں دو سو کا نقصان ہو رہا تھا، مگر کوئی علاج نہ تھا۔ روپے لیے اور چل کھڑی ہوئی۔ جس ہار کو اس نے اتنے ارمانوں سے خریدا تھا، اسے آج آدھے داموں بیچ کر اسے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ بلکہ ایک غرور آمیز مسرت ہو رہی تھی۔

جس وقت رما کو معلوم ہوگا کہ اس نے روپے ادا کر دیئے ہیں، انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ کہیں دفتر پہنچ گئے ہوں۔ وہ روپے لیے پہنچے، تو بڑا لطف آئے۔

رمیش بابو اسے دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہوا، گھر پر ملے؟''

جالپا: ''کیا ابھی تک یہاں نہیں آئے۔ گھر پر تو نہیں ملے۔'' یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کا پلندہ رمیش بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بڑے بابو نے نوٹوں کو گن کر کہا:

''ٹھیک ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک ہیں کہاں؟ اگر نہ آنا تھا تو کم

سے کم ایک خط لکھ دیتے، مجھے تو بڑا تردد ہو رہا تھا۔ تم بڑے موقع سے آ گئیں۔ اس وقت تمہاری دور اندیشی اور ذہانت دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ شریف عورتوں کا یہی وطیرہ ہے۔''

جالپا جب گھر چلی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ قد میں کچھ اونچی ہو گئی ہے۔ اس کے جسم میں خون کی حرکت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا رما اگر مکان پر متفکر بیٹھے ہوں گے، وہ جا کر پہلے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی اور خوب شرمندہ کرنے کے بعد یہ خبر سنائے گی، لیکن جب گھر پہنچی تو رما ناتھ کا کہیں نشان نہ تھا۔

جاگیشری نے پوچھا۔ ''کہاں چلی گئی تھیں، دھوپ میں بہو؟''

جالپا: ''ایک کام سے چلی گئی تھی۔ آج انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟''

جاگیشری: دفتر گئے ہوں گے۔''

جالپا: ''نہیں دفتر نہیں گئے۔ وہاں سے ایک چپڑاسی پوچھنے آیا تھا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی۔ بچے ہوئے روپے صندوق میں رکھے اور پنکھا جھلنے لگی، مگر گرمی سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک اسے اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ رما نے پردیس کی راہ لی ہے۔ چار بجے تک تو جالپا کو بہت زیادہ تردد نہ ہوا، لیکن جوں جوں دن ڈھلنے لگا اس کا انتشار بڑھنے لگا۔ آخر وہ سب سے اونچی چھت پر چڑھ گئی۔ حالانکہ وہ چھت مخدوش ہونے کے باعث کوئی اوپر نہیں جاتا تھا اور وہاں سے چاروں طرف

نظر دوڑائی، لیکن رما کسی طرف سے آتا نہ دکھائی دیا۔

جب شام ہوگئی اور رما گھر نہ آیا تو جالپا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ آخر کہاں چلے گئے۔ اگر کسی دوست کے گھر ہوتے تو کیا اب تک نہ لوٹتے۔ معلوم نہیں جیب میں کچھ ہے یا نہیں؟ بیچارے دن بھر سے نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔ وہ پھر پچھتانے لگی۔ ان کا خط پڑھتے ہی اس نے کیوں نہ ہار نکال کر دے دیا۔ کیوں پس وپیش میں پڑ گئی۔ وہ بیچارے مارے شرم کے گھر نہ آتے ہوں گے۔

چراغ جل گئے تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ سوچا شاید رتن سے کچھ پتا چلے۔ لیکن اس کے بنگلے پر گئی تو معلوم ہوا آج تو وہ ادھر آئے ہی نہیں۔

تب جالپا نے ان سبھی میدانوں اور پارکوں کو چھان ڈالا۔ جہاں رما کے ساتھ وہ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی اور نو بجتے بجتے مایوس ہو کر گھر واپس آئی۔ اب تک اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ شاید کچھ امید تھی کہ گھر پر آ گئے ہوں، لیکن جب گھر میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اب تک نہیں آئے، تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ شبہ اب مضبوط ہو گیا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میرے پیچھے آئے ہوں اور پھر چلے گئے ہوں۔ جا کر جاگیشری سے پوچھا:

''آئے ہی نہیں۔ یا دوستوں میں بیٹھے گپ شپ کر رہے ہوں گے۔ گھر تو سرائے ہے۔ دس بجے گھر سے نکلے تھے، اب تک پتا نہیں۔''

جالپا: ''وہ دفتر سے گھر آ کر تب کہیں جاتے تھے۔ آج تو آئے ہی نہیں۔ دفتر بھی نہیں گئے۔ کہیے تو گوپی بابو کو بھیج دوں۔ جا کر دیکھیں کہاں رہ گئے۔''

جاگیشری: ''لڑکے اس وقت کہاں جائیں گے۔ ان کا کیا ٹھیک ہے۔ کہیں شطرنج ہو رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ پھر کھانا اٹھا کر رکھ دینا۔ کوئی کہاں تک انتظار کرے۔''

جالپا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دفتر کی کوئی بات اس سے نہ کہی۔ جاگیشری سن کر گھبرا جاتی اور اسی وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ وہ اوپر جا کر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رہ رہ کر ایسی بے قرار ہو جاتی تھی کہ اس کا سانس تیز چلنے لگتا تھا۔ بار بار خیال آتا اگر رات بھر نہ آئے تو کیا کرنا ہوگا۔ جب تک کچھ پتا نہ چلے کہ وہ کدھر گئے تب تک کوئی جائے تو کہاں جائے۔ آج اس کے ضمیر نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ سب اس کی کرنی کا پھل ہے۔ مانا کہ اس نے زیوروں کے لیے کبھی ضد نہیں کی، لیکن اس نے کبھی صاف طور پر منع بھی تو نہیں کیا۔ اگر چوری ہو جانے کے بعد اس نے کہرام نہ مچایا ہوتا تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ مایوسی کی حالت میں جالپا اپنے ہی کو مطعون کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی، رما رشوت لیتا ہے۔ اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہے۔ پھر بھی اس نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس نے خود کیوں اپنی چادر کے باہر پاؤں پھیلایا۔ کیوں اسے روز سیر و تفریح کی سوجھتی تھی۔ جب رما اسے تحفے لا لا کر دیتا ہے تو کیوں پھولی نہ سماتی تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی جالپا اس وقت اپنے اوپر ہی لے رہی تھی۔ کیوں اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی سزا ایک دن بھگتنی پڑے گی۔ اب اسے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آ رہی تھیں، جن سے رما کی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا، مگر اس نے کبھی ان معاملات کی طرف دھیان نہ دیا۔

جالپا انہی افسوس ناک خیالات میں ڈوبی نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ جب چوکیداروں کی سیٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی، تو وہ نیچے جا کر جاگیشری سے بولی:

''وہ اب تک نہیں آئے۔ آپ چل کر کھانا کھا لیجیے۔''

جاگیشری بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لے رہی تھی۔ چونک کر بولی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

جالپا: ''وہ تو اب تک نہیں آئے۔''

جاگیشری: ''اب تک نہیں آئے۔ آدھی رات تو ہوگئی ہوگی۔ جاتے وقت تم سے کچھ کہا بھی نہیں؟''

جالپا: ''کچھ بھی نہیں۔''

جاگیشری: ''تم نے تو کچھ نہیں کہا؟''

جالپا: ''میں بھلا کیا کہتی؟''

جاگیشری: ''تو میں تمہارے دادا جی کو جا کر جگاؤں؟''

جالپا: ''اس وقت جگا کر کیا کیجیے گا۔ آپ چل کر خود کھا لیجیے۔''

جاگیشری: ''مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ ایسا من موجی لڑکا ہے کہ کچھ کہا نہ سنا، نہ جانے کہاں بیٹھ رہا۔ کم سے کم کہا تو دیتا کہ میں اس وقت نہ آؤں گا۔''

جاگیشری پھر لیٹ رہی، مگر جالپا اسی طرح بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ پہاڑ سی رات، جس کا ایک پل ایک ایک برس کی طرح کٹ رہا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ رما کا کہیں پتا نہ تھا۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ بیچارے رمیش بابو دن میں کئی کئی بار آ کر پوچھ جاتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ رما ناتھ گیارہ بجے سٹیشن کی طرف گئے تھے۔ منشی دیا ناتھ کا خیال ہے اگر چہ وہ اسے برملا ظاہر نہیں کرتے کہ رما نے خودکشی کر لی۔ ایسی حالتوں میں یہی ہوا کرتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں انہوں نے خود آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ ساس اور سسر دونوں ہی جالپا پر سارا الزام تھوپ رہے ہیں، صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ یہی ان کی جان کی گاہک ہوئی۔ اس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پوچھو تھوڑی سی تو آپ کی آمدنی، پھر تمہیں روز سیر سپاٹے، دعوت تماشے کی کیوں سوجھتی تھی۔ جالپا پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں پونچھتا۔ صرف رمیش بابو اس کی دوراندیشی اور مستعدی کی تعریف کرتے ہیں، لیکن منشی دیا ناتھ کی آنکھوں میں ان فعلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ آگ لگا کر پانی کے لیے دوڑنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔

ایک دن دیا ناتھ کتب خانے سے لوٹے، تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک تو ان کی صورت یونہی محرمی تھی، اس پر منہ لٹکا لیتے تھے تو کوئی بچہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہے۔ جاگیشری نے پوچھا:

''کیا ہے، کیا کسی سے بحث ہو گئی کیا؟''

دیا ناتھ: ''نہیں جی! ان تقاضوں کے مارے حیران ہو گیا۔ جدھر جاؤ ادھر نوچنے دوڑتے ہیں۔ نہ جانے کتنا قرض لے رکھا ہے، آج تو میں نے صاف کہہ دیا میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کسی کا دیندار نہیں، جا کر میم صاحب سے مانگو۔''

اسی وقت جالپا آ پڑی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ ان سات دنوں میں اس کی صورت ایسی بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوجھ آئی تھیں۔ منشی جی کے یہ بے رحمانہ الفاظ سن کر جیسے زخم پر نمک پڑ گیا۔ بولی:

''ہاں آپ انہیں سیدھے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں یا تو انہیں سمجھا دوں گی یا ان کے دام چکا دوں گی۔''

دیاناتھ نے برہم ہو کر کہا۔ ''کیا دے دو گی تم۔ سات سو تو ایک ہی صراف کے ہیں۔ ابھی کے پیسے دیئے ہیں تم نے۔''

جالپا: ''اس کے گہنے موجود ہیں۔ مشکل سے دو چار بار پہنے گئے ہوں گے، وہ آئے تو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں اس کی چیزیں واپس کر دوں گی۔ بہت ہو گا۔ دو چار روپے تاوان کے لیے لے گا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر جا رہی تھی کہ رتن آ گئی اور گلے سے لگاتے ہوئے بولی:

''کیا اب تک کوئی خبر نہیں ملی؟''

جالپا پر ان الفاظ میں ہمدردی اور محبت کا تسلی بخش اثر ہوا۔ یہ غیر ہو کر اتنی دلگیر ہے اور یہاں اپنے ہی ساس سسر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں۔ ان اپنوں سے تو غیر ہی اچھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی:

''ابھی تو کچھ خبر نہیں بہن۔''

رتن: ''یہ کیا بات ہوئی۔ تم سے کچھ تکرار تو نہیں ہو گئی؟''

جالپا: ''ذرا بھی نہیں۔ قسم کھاتی ہوں۔ انہوں نے نوٹوں کی چوری ہونے کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر اشارہ کر دیتے تو میں روپے دے دیتی۔ جب وہ دوپہر

تک نہیں آئے اور میں ان کی تلاش میں دفتر گئی۔ تب یہ حقیقت کھلی۔ میں نے اسی وقت روپے جمع کرا دیئے۔''

رتن: ''میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی سے آنکھیں لڑ گئیں۔ دس پانچ دن میں آپ ہی پتا لگ جائے گا۔ بات سچ نہ نکلے تو جرمانہ دوں۔''

جالپا نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ ''کیا تم نے کچھ سنا ہے؟''

رتن: ''نہیں سنا تو نہیں، لیکن میرا قیاس ہے۔''

جالپا: ''تو تمہارا قیاس بالکل غلط ہے۔ مجھے اس پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں، یہ عیب نہیں۔''

رتن نے ہنس کر کہا۔ ''اس فن میں یہ لوگ بڑے استاد ہوتے ہیں۔ تم بیچاری کیا جانو۔''

جالپا: ''اگر وہ اس فن میں استاد ہوتے ہیں تو ہم بھی مزاج شناسی کے فن میں کچھ دخل رکھتے ہیں۔ میں اسے نہیں مان سکتی۔''

رتن: ''اچھا چلو، کہیں گھومنے چلتی ہو؟''

جالپا: ''نہیں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر گھر والے یونہی درپے ہو رہے ہیں۔ تب تو زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے، کدھر جانے کا ارادہ ہے؟''

رتن: ''کہیں نہیں، ذرا بازار تک جانے کا ارادہ ہے۔''

جالپا: ''کیا لینا ہے؟''

رتن: ''جوہریوں کی دکان پر دو ایک چیزیں دیکھوں گی۔ بس تمہارے جیسا کنگن چاہتی ہوں۔ بابو جی نے بھی کی مہینے کے بعد روپے لوٹا دیئے۔ اب خود

تلاش کروں گی۔''

جالپا: ''میرے کنگن میں ایسے کون سے روپ لگے ہیں۔ بازار میں اس سے بہت اچھے مل سکتے ہیں۔''

رتن: ''میں تو اسی نمونے کے چاہتی ہوں۔''

جالپا: ''اس نمونے کا تو بنا بنایا بہت مشکل سے ملے گا اور بنوانے میں مہینوں کا جھنجٹ۔ اگر صبر نہ آتا ہو تو میرا ہی کنگن لے لو۔ میں پھر بنوالوں گی۔''

رتن نے اچھل کر کہا: ''واہ کیا تم اپنا کنگن دے دو تو کیا کہنا ہے۔ موسلوں ڈھول بجاؤ۔ چھ سو کا تھا نا؟''

جالپا: ''ہاں تھا تو چھ سو کا، مگر مہینوں صراف کی دکان کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ جڑائی تو خود بیٹھ کر کروائی تھی۔ تمہاری خاطر دے دوں گی۔''

جالپا نے کنگن نکال کر رتن کے ہاتھ میں پہنا دیئے۔ رتن کا چہرہ ایسا شگفتہ ہو گیا گویا کسی کنگلے کو پارس مل گیا ہو۔ احسان مندانہ انداز سے بولی:

''تم جتنا کہو، اتنا دے دوں۔ تمہیں دبانا نہیں چاہتی۔ تمہارے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم میری اتنی خاطر کر رہی ہو۔ مگر ایک بات ہے ابھی میں سب روپے نہ دے سکوں گی۔ اگر دو سو روپے پھر دے دوں تو کچھ ہرج ہے؟''

جالپا نے فراخدلی سے کہا: ''کچھ بھی ہرج نہیں، کچھ بھی مت دو۔''

رتن: ''نہیں، اس وقت میرے پاس چار سو روپے ہیں۔ یہ میں دیئے جاتی ہوں۔ میرے پاس رہیں گے تو کسی دوسرے کام میں خرچ ہو جائیں گے۔ میرے ہاتھ میں تو روپے ٹکتے ہی نہیں کیا کروں۔ جب تک خرچ نہ ہو جائیں،

میرے سر پر ایک بوجھ سوار رہتا ہے۔''

جالپا کا دل اس وقت مسوس اٹھا۔ اس کی کلائی پر یہ کنگن دیکھ کر رمانا تھ کیسے خوش ہوتے تھے۔ آج وہ ہوتے تو کیا یہ چیز اس طرح جالپا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ پھر کون جانے کنگن پہننا اسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے۔ رتن اس کے آنسو دیکھ کر بولی:

''اس وقت رکھ لو بہن! پھر لے لوں گی۔ جلدی ہی کیا ہے؟''

جالپا نے کنگن کی ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''کیوں کیا میرے آنسو دیکھ کر، تمہیں خوشی سے دے رہی ہوں نہیں تو یہ چیز جان سے زیادہ مجھے عزیز تھی۔ تمہارے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر۔ ہاں اتنی مہربانی کرنا کہ کسی دوسرے کو مت دے دینا۔''

رتن: ''کسی دوسرے کو کیوں دینے لگی۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھوں گی۔ آج بہت دنوں کے بعد میری دلی تمنا پوری ہوئی۔ رنج اتنا ہی ہے کہ بابو جی اس وقت نہیں ہیں۔ میرا دل تو کہتا ہے، وہ جلد ہی آ جائیں گے۔ مارے شرم کے کہیں چلے گئے ہیں۔ اور کوئی بات نہیں۔ وکیل بڑے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں مگر ان کی تو یہ حالت ہے کہ کوئی دردناک بات سنی اور تڑپ اٹھے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''ایک بات پوچھوں؟ برا تو نہ مانو گی۔ وکیل صاحب سے تمہارا دل تو نہ ملتا ہوگا؟''

رتن کا شگفتہ بشاش چہرہ ذرا دیر کے لیے تاریک ہوگیا۔ گویا کسی نے ایک ایسے دوست کی یاد دلا دی ہو، جس کے نام کو وہ بہت پہلے بھول چکی تھی۔ بولی:

''بہن ! مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں جوان ہوں اور یہ بوڑھے۔ میرے دل میں جتنی محبت جتنا ایثار ہے، وہ سب میں نے ان کے اوپر قربان کر دیا۔ محبت جوانی یا دولت یا شکل وصورت سے نہیں پیدا ہوتی۔ محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے ہی لیے وہ اس عمر میں اتنی محنت کرتے ہیں اور دوسرا ہے ہی کون۔ کیا جھوٹی بات ہے۔ کل کہیں گھومنے چلو گی۔ کہو تو شام کو آؤں؟''

جالپا: ''جاؤں گی تو میں کہیں نہیں۔ مگر تم آنا ضرور۔ دو گھڑی دل بہلے گا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ برے برے خیال آتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں مجھ سے اتنا حجاب کیوں تھا۔ شاید یہ بھی میری ہی خطا ہے۔ مجھ میں ضرور انہوں نے کوئی ایسی برائی دیکھی ہوگی، جس کے باعث وہ مجھ پر اعتبار نہ کر سکتے تھے۔ مجھے اگر رنج ہے تو یہی کہ وہ مجھے غیر سمجھتے رہے، جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس سے پردہ نہیں رکھتے۔''

رتن اٹھ کر چلی تو جالپا نے دیکھا کنگن کا بکس میز پر پڑا ہے۔ بولی:

''اسے لیتی جاؤ بہن کیوں چھوڑے جاتی ہو۔''

رتن: ''لے جاؤں گی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی پورے روپے تو نہیں دیئے۔''

جالپا: ''نہیں نہیں لیتی جاؤ، میں نہ مانوں گی۔''

مگر رتن سیڑھی سے نیچے اتر گئی اور جالپا ہاتھ میں کنگن لیے کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جالپا نے صندوق سے پانچ سو روپے نکالے اور دیا ناتھ کے پاس جا کر بولی: